بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جس طرح آئندہ مالی سال کے آمد و خرچ کو متوازن رکھنے کے لیے میزانیہ کی تیاری ضروری ہوتی ہے بالکل اسی طرح مستقبل کی لغزشوں سے بچنے کے لیے ماضی کا محاسبہ بھی ضروری ہے کیونکہ اس محاسبے کے بغیر نہ تو ماضی کی کوتاہیوں کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے اور نہ مستقبل کی تعمیر کے لیے کوئی پائیدار بنیادیں فراہم ہوسکتی ہے۔ اگر حکمران جماعت اپنی گذشتہ ایک سال کی کارگزاریوں کا غیر جانبداری سے جائزہ لے اور اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے گوشوارہ کو سامنے رکھ کر آئندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کرے تو اس سے نہ صرف ملک اور قوم کو فائدہ پہنچے گا بلکہ عوام کے اندر اس کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا ملنے کے امکانات روشن ہوں گے اور اس طرح اس کا عہدِ اقتدار بھی طویل ہوسکے گا۔

برسرِ اقتدار طبقے کو خاص طور پر بھٹو صاحب کو ان کارگزاریوں کا جائزہ لیتے وقت چند باتیں اچھی طرح نگاہ میں رکھنی چاہییں۔ ان میں پہلی بات یہ ہے کہ عوام ملک میں مارشل لا کو کسی طور پر پسند نہیں کرتے کیونکہ اس کے تلخ ثمرات کا مزہ وہ پوری طرح چکھ چکے ہیں۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ مارشل لا نے ان کی منزل کو کس طرح کھوٹا کیا ہے اور انحطاط کے کن خوفناک غاروں کی طرف اسے دھکیلا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس آئین لے آئین کے تحت ان کے جمہوری حقوق سلب ہوتے ہیں۔ ان کے اندر مختلف فتنوں کو سر اٹھانے کے مواقع ملتے ہیں، اس کی شہ پا کر حکمرانوں نے عوام پر بغیر کسی خوف کے دستِ ظلم دراز کیا ہے۔ اس کے زیرِ سایہ نوکر شاہی کو اتنی غیر معمولی طاقت حاصل ہوئی ہے کہ وہ اب صحیح معنوں میں بادشاہ گر کہلانے کی مستحق ہے، اسی کا تحفظ پا کر ملک کے اندر غنڈہ گردی، اقربا پروری، چور بازاری کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے۔ پھر اس مارشل لا کی وجہ سے فوج کو ایسی ذمہ داریاں اٹھانی پڑی ہیں جو ازروئے انصاف کسی طرح بھی اس کے حصے میں نہیں آتیں اور اس سے یہ ایک ناروا

بوجھ کے طور پر خواہ مخواہ اپنی کمر پر لادنی پڑی ہیں۔ مارشل لائی ان ساری قہرمانیوں اور ان کے عبرتناک نتائج جن میں غالباً سب سے خوفناک نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے، کو دیکھتے ہوئے ملک کا کوئی بہی خواہ بھی مارشل لا کے نفاذ کی حمایت نہیں کر سکتا۔

دوسری بات جسے بھٹو صاحب کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے یہ ہے اس ملک میں کوئی ایک بھی حزبِ اختلاف ایسی نہیں جو طاقت سے ان سے اقتدار چھیننا چاہتی ہے۔ ساری سیاسی پارٹیاں بار بار انہیں اس امر کا یقین دلا رہی ہیں کہ وہ چونکہ ووٹوں کے ذریعے مسندِ اقتدار پر براجمان ہوئے اس لیے وہ شوق سے حکومت کریں۔ وہ ان سے بالجبر تختِ اقتدار خالی کرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتیں، بلکہ ان سے صرف یہ مطالبہ کر رہی ہیں کہ وہ ملک میں جمہوریت کے تقاضوں کو پورا کریں۔ مگر معلوم نہیں کہ بھٹو صاحب کس نفسیاتی کیفیت کے تحت اس موہوم خطرے کو حقیقت سمجھ کر یہ دہشت پھیلا رہے ہیں کہ مخالف جماعتیں مجھے مسندِ اقتدار سے محروم کرنا چاہتی ہیں اور پھر اندرونی خوف کے اس جذبہ کے زیرِ اثر مخالف جماعتوں کو عبرتناک انجام سے دوچار کرنے کی وعید سناتے رہتے ہیں۔ اور انہیں یہ کہہ کر لرزہ براندام کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انہوں نے جب تشدد کیا تو گلی گلی اور کوچے کوچے قوم کا خون بہے گا اور یہ خون اتنا ارزاں ہو گا کہ ہمالیہ بھی اس قوم کی بدنصیبی پر خون کے آنسو بہائے گا۔

بھٹو صاحب کا یہ اندازِ فکر اور اندازِ بیان کسی نہایت خوفناک نفسیاتی اضطراب کا پتہ دیتا ہے اُن کے پاس کوئی ایسے ٹھوس وجوہ تو موجود نہیں جن سے وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ مخالف سیاسی جماعتیں انہیں زبردستی اقتدار سے ہٹانے کے درپے ہیں۔ وہ اپنے اس خدشے کی تائید کے لیے نہ تو ان جماعتوں کے کسی ذمہ دار لیڈر کا کوئی بیان پیش کر سکتے ہیں اور نہ ان جماعتوں کی کسی روش سے وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ فی الحقیقت اس مقصد کی تکمیل کے لیے سرگرداں ہیں۔ صدرِ مملکت اپنے ایوانِ اقتدار میں جو زلزلہ محسوس کر رہے ہیں اُس کا لاوا کسی مخالف قوت کی طرف سے تو پھوٹتا نظر نہیں آتا۔ اس زلزلے کے خطرے کا احساس یا تو انکے ذہن میں اُبھرنے والے موہوم اندیشوں کی پیداوار ہے یا اگر فی الواقع کوئی ایسا خطرہ خارج میں موجود ہے تو اس کا آتش فشاں خود انکی ذات! در مسندِ اقتدار کے بالکل قرب جوار میں پایا جاتا ہے اس لیے صدر بھٹو صاحب کو غیروں کو دھمکیاں دینے اور انہیں عذابِ الیم کا مزہ چکھانے کے بجائے اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھنا چاہیے کہ کہیں ان اندیشوں کی جڑیں ان کے لاشعور میں تو پیوست نہیں یا ان کے یمین و یسار میں جو لوگ موجود ہیں کہیں وہ تو

اپنی کرتوتوں سے ایسا وحشتناک ماحول تیار نہیں کر رہے جس میں سوائے تاریکیوں کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی ہو اور صدر صاحب جب اس ماحول کی ہولناکیوں سے دہشت زدہ ہو کر اس کے متعلق سوچنے لگتے ہوں تو اُن کے مصاحبین اُن کے کان میں یہ بات ڈال دیتے ہوں کہ حضور یہ مخالف سیاسی جماعتوں کا کارنامہ ہے۔

معلوم نہیں ہماری نحیف آواز صدرِ مملکت کے کانوں تک پہنچتی بھی ہے یا نہیں مگر ہم صحیح صورتِ حال سے انہیں آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اِس ضمن میں ہم ان کی خدمت میں پہلی گذارش یہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کبھی کبھی سیاست کے ہنگاموں سے الگ ہو کر "اندرون بینی" اور خود شناسی کے لیے وقت نکالا کریں۔ کیونکہ اِس مشق کے بغیر کوئی آدمی بڑا نہیں بن سکتا۔ اگر یہ مشق نہ کی جاتے تو انسان اپنی ساری کمزوریوں اور ناکامیوں کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور اس بنا پر بلا وجہ دوسروں کو اپنا دشمن سمجھ کر اُن سے ٹکراتا رہتا ہے۔ انہیں اپنے دل کے اندر جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ جس دشمن کو وہ اپنے خیال کے مطابق اپنے مخالفوں کی صفوں میں تلاش کر رہے ہیں وہ کہیں اُن کے دل کے کسی گوشے میں چھپ کر انہیں پریشان تو نہیں کر رہا۔ اگر بھٹو صاحب اس دشمن کو ڈھونڈنے کے لیے تیار ہوں تو پھر ہم ان کے دل کے اُن گوشوں کی بھی نشان دہی کر دیتے ہیں جنہیں یہ دشمن کمین گاہ کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔

عام طور پر تین طرح کی نفسیاتی کیفیات موہوم خدشات کو انسان کے اندر اُبھارتی ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق ماضی کے واقعات سے ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جو حال کی بعض ناکامیوں کی پیداوار ہوتی ہیں اور تیسرے وہ جن کی وجہ سے انسان کے دل کا چور خطرے کا روپ دھار کر اُس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ جہاں تک ماضی کا تعلق ہے تو اس کی ایک توجیہ جو ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ممکن ہے صدرِ محترم قوت کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے کے خود متمنی رہے ہوں اور اِس نہج پر وہ ایک طویل عرصہ تک سوچتے رہے ہوں اور انہیں نہ تو اس کا حوصلہ پڑا ہو اور نہ موزوں موقع میسر آیا ہو اور اِس طرح اُن کی اِس دبی ہوئی اور ناکام تمنا نے اُن کے لاشعور کے کسی گوشے میں پناہ لیکر ناسور کی صورت اختیار کر لی ہو جو انہیں برابر پریشان کرتا رہتا ہے اور اُن کے دماغ میں یہ احساس بار بار اُبھرتا ہے کہ قوت کے بل بوتے پر اقتدار ہر وقت چھینا جا سکتا ہے۔ نفسیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اکثر اوقات ہماری ناکام آرزوئیں اور اُدھورے عزائم لاشعور کے اتھاہ سمندر میں ڈوب کر خوفناک

چٹانوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جن سے ہمیں ہر لحظہ دھڑکا لگا رہتا ہے۔ صدر بھٹو صاحب کے مزاج اور اُن کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے یہ بات کوئی بعید از قیاس بھی معلوم نہیں ہوتی جس آمر کی غیر مشروط اطاعت اور فرمانبرداری میں انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا وہ وہی شخص ہے جس نے اس ملک میں طاقت کے بل بوتے پر اقتدار چھیننے کا سب سے پہلے تجربہ کیا۔ اگر بھٹو صاحب کا طرزِ فکر ان صاحب سے مختلف ہوتا اور وہ طاقت کی مدد سے تختِ اقتدار پر براجمان ہونے کو غلط سمجھتے تو وہ یقیناً اس شخص سے کبھی تعاون کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتے جس نے اس ملک میں یہ غلط ریت ڈالی تھی۔ مگر بھٹو صاحب ہر معاملے میں اُن کے اس حد تک مؤید اور حامی رہے کہ بسا اوقات انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ کیا ذوالفقار علی بھٹو نام کی کوئی الگ شخصیت بھی موجود ہے۔

ایوب صاحب کے حلقۂ ارادت سے نکلنے کے بعد انہوں نے مسندِ اقتدار پر فائز ہونے کے لیے جن طور طریقوں کو اپنایا انہیں دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ ان طریقوں سے کام لینے والا فرد سیاست کے میدان میں تشدد کا قائل نہیں اور دلائل کے زور سے بازی جیتنا چاہتا ہے۔ انہوں نے بلاشبہ پاکستان کے دو صوبوں میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کر کے میدان مار لیا مگر جس انداز سے انہوں نے عوام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج کیں اور جس دھونس اور دھاندلی کے ذریعے اُنہوں نے اپنے آپ کو آگے بڑھایا اُس سے یہ بات پوری طرح عیاں ہے کہ یہ شخص عوام کی ذہنی تربیت کر کے آگے بڑھنے کا قائل نہیں بلکہ اُن کے فکری جہاز بے لنگر کر کے اور طوفان اٹھا کر اُنہیں اپنے ساتھ بہائے جانا چاہتا ہے۔ جمہوری عمل اور فاشسٹ حربوں میں جو نوعی فرق پایا جاتا ہے وہ ووٹ کا استعمال اور عدمِ استعمال نہیں۔ انتخابات کا ڈھونگ تو بسا اوقات فاشسٹ ممالک میں بھی رچایا جاتا ہے مگر یہ ڈھونگ ہی ہوتا ہے۔ اس کا مقصد رائے عامہ کو آگے بڑھ کر کام کرنے کا موقع فراہم کرنا نہیں ہوتا۔ جمہوریت اور فاشزم کے مابین اساسی فرق یہ ہے کہ جمہوریت میں عوام کے شعور کو جلا دے کر اسے یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ قومی تعمیر و ترقی کی نہ صرف راہ متعین کرے بلکہ عملاً اُس پر گامزن ہونے کے طور طریقے بھی بتائے۔ اس کے بعد جن لوگوں کو عوام کی قیادت اور سربراہی کے لیے منتخب کیا جائے اُن کے افکار و اعمال کا برابر محاسبہ بھی کرتا رہے۔ آپ اگر کسی ملک میں جمہوری عمل کا مطالعہ کریں تو آپ کو واضح طور پر یہ معلوم ہو گا کہ جمہوریت ایک ایسا تربیتی ادارہ ہے جس میں آزادی کے تحفظ کے ساتھ ساتھ انسانوں کے شعور کی بھی باقاعدہ تربیت کی جاتی ہے اور اُسے بیدار رکھنے کا بھی پورا التزام ہوتا ہے۔ اس بنا پر جو جماعتیں جمہوری

عمل کے ذریعے برسرِ اقتدار آنے کی کوشش کرتی ہیں وہ پہلے مرحلے پر ارکان کی تربیت کرتی ہیں، اور انہیں سوچنے اور سمجھنے کا تعمیری انداز عطا کرتی ہیں تاکہ وہ فیصلہ کن مراحل پر ٹھیک ٹھیک قدم اٹھا سکیں لیکن اس کے برعکس جو جماعتیں فاشسٹ عزائم لے کر اٹھتی ہیں وہ عوام کے شعور کو بیدار کرنے کے بجائے اُن کے اندر ہیجانی کیفیات پیدا کرتی ہیں، تاکہ شعور معطل ہو کر رہ جائے اور وہ جذبات کے دھارے میں عوام کو جس رُخ چاہیں بہا کر لے جائیں۔ یہ جماعتیں اپنی صلاحیتیں لوگوں کی ذہنی تربیت کرنے میں نہیں کھپاتیں بلکہ عوام سے جھوٹے وعدے کرنے، انہیں مستقبل کے بارے میں سُہانے خواب دکھانے، ان کے ذہنوں کو مفلوج کرنے، مخالفین کو گالیاں دینے اور انہیں بدنام کرنے اور مختلف حیلوں اور بہانوں سے غنڈوں اور سماج دشمن عناصر کو اپنے ساتھ شامل کر کے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے میں صرف کرتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے وجود سے معاشرے میں جمہوری عمل یکسر معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور انتخابات رائے عامہ کے اظہار کا ذریعہ بننے کے بجائے فاشسٹ رہنماؤں کی غیر معمولی طاقت کی نمائش کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور فاشزم کے علمبردار لیڈر جو کچھ فوج اور گولی کی قوت سے حاصل کرنے کے آرزومند ہوتے ہیں۔ وہ انتخابات اور ووٹ کے ذریعے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ صدر بھٹو نے جس انداز سے اپنی پارٹی کے کارکنوں کی تربیت کی ہے اور آج بھی وہ اِن سے جس طرح کام لے رہے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے کوئی عقل مند شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ صدر صاحب اس ملک میں جمہوری عمل کا فروغ چاہتے ہیں۔ ان کے طور طریقوں پر تو فاشزم کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس بنا پر عین ممکن ہے کہ قوت کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے کا جو سودا ان کے دل میں سمایا ہوا تھا اُس نے وقت کے گزرنے کے ساتھ کسی خوفناک مرض کی صورت اختیار کر لی ہو۔ جس کی وجہ سے وہ بار بار اس خطرے کو مخالف جماعتوں کے جسم سے سُونگھ رہے ہیں در آنحالیکہ اِس خطرے کا احساس تو ان کے اپنے دل و دماغ میں موجود ہے۔ صدر صاحب کو اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے ذہن میں اس خطرے کی موجودگی کی دوسری وجہ ان کی ناکامیوں اور محرومیوں کا احساس بھی ہو سکتی ہے جن سے ایک سال میں انہیں دوچار ہونا پڑا ہے اور جس کا انہوں نے ۱۹ دسمبر کو دبی زبان میں جشنِ کامرانی کے انعقاد کے سلسلے میں اظہار بھی فرمایا ہے۔ الفاظ خواہ کچھ بھی ہوں مگر یہ حقیقت تو کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ وہ خود اپنی کامیابیوں پر اس طرح مطمئن نہیں جس طرح کہ اُن کے مُصاحبین

ان کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ لیکن اُن کے بعض دوسرے بیانات کو اگر سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ان کے بارے میں اُن کا طرز فکر حقیقت پسندانہ نہیں ہوا بلکہ مختلف قسم کی خوش فہمیوں میں گرفتار نظر آتے ہیں لیکن اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قوم بھٹو صاحب کے عہد اقتدار میں ترقی کرنے کے بجائے ہر لحاظ سے تنزل و انحطاط کی طرف گئی ہے۔ اور ان کے سولہ سولہ اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنے کے کوئی مفید نتائج برآمد نہیں ہو سکے۔

حکمران جماعت اپنی جن اصلاحات کو سب سے بڑا کارنامہ سمجھتی ہے وہ تین ہیں: زرعی اصلاحات، صنعتی اصلاحات اور تعلیمی اصلاحات۔ جہاں تک زرعی اصلاحات کا تعلق ہے ان سے ملک کے اندر کوئی خوش آئند تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ غریب کاشت کار ابھی ساڑھے بارہ ایکڑ اراضی کے حصول کے منتظر ہیں۔ حکومت نے ان اصلاحات کے ذریعے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جو چالیس لاکھ ایکڑ اراضی حاصل کی ہے۔ اس سے بے زمین کاشتکار ابھی تک محروم ہیں۔ البتہ زمیندار اور کاشت کار کے درمیان آویزش اور نفرت بڑھ گئی ہے جس کی وجہ سے آئے دن ان کے مابین تصادم ہوتے رہتے ہیں۔

صنعتی اصلاحات کے تحت حکومت نے بلاشبہ بعض بنیادی صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا ہے مگر اس سے نہ تو ملکی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے اور نہ بندۂ مزدور کے اوقات کی تلخی ہی کم ہوئی ہے۔ پہلے اگر اسے مالک کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہونا پڑتا تھا تو اب بیروزگاری کا خوف ہر وقت اس کے سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ صنعتی اضطراب تو جوں کا توں ہے مگر اس کے ساتھ صنعتی پیداوار میں تشویشناک حد تک کمی ہو گئی ہے۔ ایک سال پہلے ہماری صنعتیں اپنی پیداواری صلاحیت کا صرف تیس فیصد حصہ بروئے کار لاتی تھیں اور آج سرکاری ماہرین اقتصادیات بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ ہماری صنعتی پیداوار مجموعی پیداواری گنجائش کا صرف ۱۸ فیصد رہ گئی ہے اس پر ہماری مالیاتی عاقبت نااندیشیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔ روپے کی شرح میں غیر معمولی کمی، براہ راست اور بالواسطہ ٹیکسوں میں اضافہ، آئے دن جشن منانے پر روپے پیسے کا زیاں وزیروں اور مشیروں کی فوج ظفر موج کا قیام اور ان کی بھاری تنخواہوں اور دوسرے اخراجات اور غلط منصوبہ بندی نے عوام کو ہوشربا گرانی کے جنگل میں گرفتار کر رکھا ہے جس کی بنا پر زندگی ان کے لیے عذاب بن گئی ہے یہی کیفیت تعلیمی اصلاحات کی بھی ہے۔ ان اصلاحات کی وجہ سے تعلیمی معیار اور مختلف اداروں کا تعلیمی ماحول جس طرح

تباہ ہوا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں اپنے بچوں کی تعلیم سے دلچسپی ہے یا جو تعلیم کو ایک مقدس فرض سمجھتے ہوئے اسے سرانجام دینے میں مصروف ہیں۔

ملک کی سیاسی زندگی ایک خوفناک ویرانے یا کسی ہولناک جنگل کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ قوم کے اندر اتحاد اور سالمیت کے احساسات ابھرنے کے بجائے افتراق و انتشار کے خطرناک رجحانات بڑی سرعت کے ساتھ پیدا ہو رہے ہیں۔ امن و امان کی صورت نہایت ناگفتہ بہ ہے۔ مغربی پاکستان کا کوئی صوبہ بھی ایسا نہیں جہاں لوگ اپنے آپ کو حکومت اور غنڈہ عناصر کی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون پاتے ہوں۔ برسر اقتدار طبقہ اپنے مخالفوں کو دبانے میں تمام اخلاقی اور قانونی حدود کو بری بیدردی سے پامال کر رہا ہے۔ جو شخص حکومت کی نظر میں اپنے سیاسی موقف کی وجہ سے ذرا معتوب ہوتا ہے، اس بیچارے پر عرصہ حیات تنگ ہونے لگتا ہے۔ ایک طرف اُسے متعدد مقدمات میں اُلجھایا جاتا ہے۔ دوسری طرف حکومت کے اخبارات اس کی تذلیل شروع کر دیتے ہیں، اور تیسری طرف حکومت کی سرپرستی میں پلنے والے غنڈہ عناصر اُس کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں۔ خوف و ہراس کی اس فضا میں یا تو وہ زبان پر تالے لگا لیتا ہے یا پھر حکومت کے مظالم کا تختہ مشق بنتا ہے۔ پنجاب میں ڈاکٹر نذیر احمد اور خواجہ رفیق کے قتل کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ ملک و ملت کے یہ غمگسار حکومت کے بعض کاموں پر حرف گیری کرنے کی جسارت کرتے تھے۔ اسی طرح آغا شورش کاشمیری، حافظ احسان الٰہی ظہیر، جناب حمزہ اور حزب اختلاف کے بعض دوسرے زعماء کو جس مختلف حیلوں اور بہانوں سے ستایا اور پابندِ سلاسل کیا جا رہا ہے، اس کے پیچھے اگر حکومت کی فسطائی ذہنیت کام نہیں کر رہی تو اور کونسی چیز کار فرما ہے۔ جمہوریت کی رُوح یہ ہے کہ تنقید کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے اور اختلاف رائے کا اظہار کرنے والوں کی بات توجہ سے سُنی جائے۔ ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو کر آپے سے باہر ہو جانا اور ہر مخالف آواز کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے قوت کے زور سے اُسے دبانے کی کوشش کرنا جمہوریت کی راہ نہیں بلکہ فاشزم کا اندازِ حکمرانی ہے۔

پچھلے دنوں طلبہ کے معاملے میں حکومت نے جس سنگدلی اور تشدد پسندی کا مظاہرہ کیا اُسے دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ کوئی حساس انسان یہ ظالمانہ سلوک بچوں سے کر سکتا ہے؟ کجا کہ یہ بچے خود اس کی

(باقی ص ۲۶ پر)

بقیہ اشارات

اپنی قوم کے نونہال ہوں۔ ان بچوں نے آخر ملک و ملت کے خلاف کوئی سازش تو نہ کی تھی جس کی وجہ سے اُن پر یہ ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے گئے۔ وہ صرف بنگلہ دیش کے معاملے میں اپنے احساسات سے حکومت کو آگاہ کرنا چاہتے تھے مگر حکومت نے ان کے احساسات سے آگاہ ہونے کے بجائے ان کی اس کوشش کو گستاخی بلکہ سرکشی پر محمول کیا اور برسرِ اقتدار طبقہ پُوری قوت کے ساتھ ان معصوم بچوں کے مقابلے میں اس طرح خم ٹھونک کر میدان میں آگیا جس طرح کوئی سپاہ دشمن پر یلغار کرنے کے ارادے سے میدانِ جنگ میں اُترتی ہے۔ اس ملک کے حکمران طبقے کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ کیا اس طرح کے حربے اختیار کرنے سے وہ جمہوریت کے علمبردار کہلانے کا مستحق ہوگا یا تاریخ میں وہ جمہوریت کے نام پر فسطائی نظام برپا کرنے والے کی حیثیت سے یاد رکھا جائیگا۔ اس امر کا جائزہ لیتے وقت صدر بھٹو صاحب کے ان وعدوں کو بھی سامنے رکھنا چاہیے، جو انہوں نے اقتدار میں آنے سے پہلے ملک میں جمہوریت کو فروغ دینے کے سلسلے میں قوم سے کیے تھے۔

اندرونِ ملک سے نظریں ہٹا کر جب ہم بیرونِ ملک کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو بین الاقوامی سیاست میں بھی بھٹو صاحب کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دیتے نظر نہیں آتے جس سیمابی مزاج کا مظاہرہ وہ ملک کے اندر کرتے رہتے ہیں اس کا مظاہرہ وہ بین الاقوامی معاملات میں بھی کرتے ہیں۔ چند ماہ پیشتر بنگلہ دیش کے معاملے میں اُن کے احساسات کا یہ عالم تھا کہ جو ملک اسے تسلیم کرتا تھا وہ فوراً اُس سے تعلقات منقطع کر لیتے تھے۔ اسی احساس کے تحت اُنہوں نے دولتِ مشترکہ کو بھی خیرباد کہا اور کئی ایک ممالک سے اپنے سفارتی تعلقات یک لخت توڑ دیئے مگر اب بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا سودا ان کے ذہن میں اس بُری طرح سمایا ہوا ہے کہ وہ اس کے خلاف کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کے طرزِ فکر میں اس نمایاں تبدیلی کی وجہ بظاہر تو کوئی نظر نہیں آتی۔ بین الاقوامی سیاست میں کوئی ایسے دُور رس تغیرات تو رونما نہیں ہوتے ہیں جن کے پیشِ نظر پاکستان اپنی پالیسی تبدیل کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہو پھر فکر و نگاہ کی اس عظیم تبدیلی کی وجہ بجز بھٹو صاحب کے ذاتی رجحان کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ کیا دنیا کے کسی جمہوری ملک میں صدر کے ذاتی رجحانات کی اساس پر اس کی داخلی اور خارجی پالیسیاں مرتب کی جاتی ہیں؛ خصوصاً ایسے صدر کے ذاتی رجحانات پر جس کی طبیعت سیماب آسا ہو اور جو اہم سے اہم مسائل کو عقل و دانش کی معتدل میزان

پر تول کر حل کرنے کے بجائے انہیں جذبات کی شعلہ فشانیاں کی مدد سے طے کرنے کا عادی ہو۔ سطحی جذباتیت جمہوریت کا نہیں بلکہ فاشزم کا کارگر ہتھیار ہوتا ہے۔

اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک صدر بھٹو کو جوان کے حسبِ منشا بلند و بالا مقام حاصل نہیں ہو سکا، اُس کی وجہ سے بھی ان کے تحت الشعور میں موہوم خطرات پرورش پاتے رہتے ہیں۔ اِسے انسان کی یہ کوتاہ نظری سمجھیے یا حقائق کا سامنا کرنے سے فطری گریز کہ وہ انسانوں سے اُس قدر و منزلت کا تقاضا کرتا ہے۔ جس کا وہ خود اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہے مگر انسان اوّل تو اسے عزت و توقیر کا اُس کی خواہش کے مقابلے میں کم تر مقام دیتے ہیں، یا اگر مصنوعی طریقے سے وہ اپنے مقام کو بلند تر بھی ثابت کر دے تو عوام اس کی ہمنوائی نہیں کرتے۔ عوام دل کی گہرائیوں میں اُسے وہی مقام دیتے ہیں جس کا وہ اپنے کارناموں کی وجہ سے مستحق ہوتا ہے۔ یہ تو تاریخ میں بارہا ہُوا ہے کہ نہایت اُونچے لوگ زمانے کے تغافل کی وجہ سے عوام کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے، مگر یہ کبھی نہیں ہُوا کہ کم حیثیت لوگ بعض نمائشی کاموں کی مدد سے تاریخ میں کسی نمایاں حیثیت کے مالک بن گئے ہوں۔ یہ دنیا کا فی الحقیقت ایک عجوبہ ہے کہ عوام کے قافلے اگر ہر رہرو کے ساتھ تھوڑی دُور چلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اس معاملے میں کوئی زیادہ تدبّر اور دانائی کا ثبوت نہیں دیتے مگر عوام کی عدالت ان قافلوں کی رہنمائی کرنے والوں کے بارے میں بڑے بے لاگ فیصلے کرتی ہے۔ دنیا میں بے شمار لوگ ایسے گزرے ہیں جو جب تک تختِ اقتدار پر براجمان رہے اُن کے مصاحبین نے انہیں عمرِ ثانی کے القابات دیئے مگر تاریخ نے عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو عمرِ ثانی تسلیم نہیں کیا۔ جونہی اُن کے اقتدار کا دَور ختم ہُوا ان کا یہ اعزاز بھی ان سے چھِن گیا اور تاریخ کی کسوٹی نے ہر سکّے کو اچھی طرح پرکھ کر اُسے اس مقام پر محفوظ کیا جس کا کہ وہ فی الحقیقت مستحق تھا۔ اسے تاریخ کے المیے کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ شہرت اور ناموری کے حریص لوگ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور جس اونچے مقام کے وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتے ہیں وہ جب انہیں ملتا نظر نہیں آتا تو وہ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں پر غور کرنے کے بجائے اُسے دوسروں کی سازش خیال کرنے لگتے ہیں اور اُن پر دستِ ظلم دراز کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ذہنی عارضہ ہے جو اگر کسی عام انسان میں بھی پایا جائے تو اُس سے اُس کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی ذات سے اذیّت پہنچتی ہے لیکن جب یہ عارضہ ملک کی سب سے بڑی اور با اثر شخصیت کو لاحق ہو تو اس کی تباہ کاریوں کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ فلسفہ تاریخ کے ایک بہت بڑے مفکّر سے کسی شخص نے

یہ سوال کیا کہ تم نے ساری عمر تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے مطالعہ میں صرف کی ہے تو آخر اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے اس نے بڑے دکھ کے ساتھ یہ کہا کہ میں نے تاریخ سے جو کچھ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان نے تاریخ سے کبھی کوئی سبق نہیں سیکھا اور یہی انسانیت کی سب سے بڑی بدبختی ہے۔ خدا کرے کہ موجودہ حکمران اپنے پیش روؤں کے عبرتناک انجام سے کوئی سبق حاصل کر سکیں۔ ماضی کے واقعات سے عبرت پکڑنا انسان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

- اسلام اجتماعی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے فرد کی سیرت میں کن بنیادی خصوصیات کو دیکھنا چاہتا ہے۔
- اجتماعی زندگی کی بنیادوں کو منہدم کرنے والی کونسی چیزیں ہیں جن سے بچا جائے؟
- اجتماعی زندگی کو مضبوط کرنے والی کونسی صفات ہیں جن کو اختیار کیا جائے؟

تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کی تعمیرِ سیرت کے منصوبہ کی پوری اسکیم

تحریکِ اسلامی میں کارکنوں کے باہمی تعلقات

از: خرم جاہ مراد

طباعت فوٹو آفسٹ ـــــ معیاری کتابت ـــــ صفحات ۱۴۰

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۳/۰۰ سستا ایڈیشن ۲/۲۵

مکتبۂ چراغِ راہ

۲۔ یوسف منزل، ہرمزجی اسٹریٹ، گاڑی کھاتہ، کراچی۔